R. No. [illegible]

Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. [illegible]

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۲ - شمارہ ۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء

نادم سیتاپوری

ماہنامہ "آفتاب"

ریاض خیرآبادی، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی وغیرہ کی طرح آغا شاعر دہلوی کے بارے میں بھی یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا کہ بحیثیت شاعر ان کی اہمیت زیادہ ہے یا بحیثیت ادیب، نثار یا صحافی۔ ریاض کی خمریات نے "ریاض الاخبار"، "تار برقی"، "صلح کل"، "فتنہ" اور "عطر فتنہ" سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ حسرت کے "اردوئے معلی" کا ذکر بھی اب کم ہی سننے میں آتا ہے۔ غزل کے جدید تنقیدی زاویے ضرور کبھی کبھی حسرت کی خداداد شعری صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں، حالانکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ بہت سی کروٹیں بدلنے کے باوجود ان کی بیش قیمت قربانیوں کے اذکار سے ابھی تک خالی نظر نہیں آتی۔ کم و بیش یہی حال ظفر علی خاں کا ہے جو اپنے دور کے مشہور ترجمہ نگار ہی نہیں، بلکہ بے تخلص شعرا کی صف اول میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ صحافت انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ "زمیندار"، "دکن ریویو"، "افسانہ"، "پنجاب ریویو" اور پھر "ستارۂ صبح" نے تو ایک زمانے میں ایسی دھوم مچائی کہ اقبال کی مثنویاں ایک اچھے خاصے ادبی معرکے کی زد میں آگئیں لیکن سیاست ان کا مقدر ہو چکی تھی "شیر پنجاب" پر خاتمہ ہوا ان کا۔

افسر الشعرا آغا مظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی (۱۸۷۱ء - ۱۹۴۰ء) کی ادبی زندگی جس مد و جزر کا شکار رہی اسے آج بھی ایک مرکز پر قرار نہیں۔ رباعیات عمر خیام کا اردو ترجمہ خمریات کا شاہکار ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ڈرامے اور ناول بھی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہو چکے ہیں! البتہ "آصف الاخبار"، "دلہن"، "حسن اردو" اور ماہنامہ "آفتاب" جنھیں آغا شاعر کی صحافتی زندگی کا ماحصل کہنا چاہیے اس طرح ہمارے ذہن و شعور سے محو ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ چند روز میں ان کے دھندلکوں کا تصور بھی باقی نہ رہے گا۔ "دلہن"، "آصف الاخبار" اور "حسن اردو" کی فائلوں کا تو ذکر کیا؟ اب ایک شمارہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی حال "آفتاب" کے پہلے دور کا ہے۔ شاید اس کے آخری دور کے کچھ پرچے کہیں محفوظ ہوں لیکن مجھے اب تک فراہم نہ ہو سکے۔ مجھے "آفتاب" کے دوسرے دور کی ایک نامکمل جلد "مدرسۃ الواعظین لکھنؤ" کے کتب خانے سے دستیاب ہوئی اور یہی اس مضمون کا سرچشمہ ہے۔

آغا شاعر دہلوی سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں کا شکار ہو کر کم عمری میں اس طرح گھر سے نکلے کہ پھر تمام عمر اس گھر میں واپس نہ گئے۔ دلی چھوٹی، لاہور پہنچے اور پھر حیدرآباد دکن، بھوپال، لکھنؤ اور متعدد دیسی ریاستوں میں قسمت آزمائی کرتے رہے! مدتوں خواجہ حسن نظامی، سر عبدالقادر اور راشد الخیری وغیرہ کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کے دربار تک رسائی ہوئی لیکن وہاں بھی نہ جمے۔ آخرکار سنہ ۱۹۲۰ء سے کچھ پہلے راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست "جھالرا پاٹن" نے قدر افزائی کی۔ درباری شاعر کی حیثیت سے معزز کیے گئے مگر چند ہی روز میں مہاراج کی علم دوستی اور معارف پروری نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انھیں اپنے فطری ذوق کی تکمیل کا ایک بار پھر موقع ملا اور ماہنامہ "آفتاب" کے دوسرے دور کا آغاز مارچ سنہ ۱۹۳۰ء سے ہوا۔

ماہنامہ "آفتاب" خود آغا شاعر کی ملکیت تھا جسے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے "آغا آفتاب علی قزلباش" کے نام پر نکالا تھا لیکن جب یہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوا تو جھالرا پاٹن کے مہاراجہ ہز ہائینس سر بھوانی سنگھ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اس میں کچھ نظر آنے لگے۔ "آفتاب" کے سرورق پر مہاراجہ کا نام

(۱) [illegible] "آفتاب" [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کا صرف ایک شمارہ شائع ہوا تھا۔

روپیہ ڈیفنس ڈپازٹ سرٹیفکیٹوں میں لگائیے

بحیثیت سرپرست چھپتا تھا اور "آفتاب" کا دفتر مہاراجہ کے "قلعہ" میں قائم تھا۔ ریاست کے "سنٹرل جیل پریس" کے سپرد اس کی چھپائی وغیرہ کا انتظام تھا۔ مہاراجہ کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے بہت سے فرمانروا اس کے مربی اور سرپرست ہو گئے تھے جن میں نظام دکن، مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ بیکانیر، نواب بھوپال، مہاراجہ راج گڑھ، نواب ٹونک، مہاراجہ کھیلی پور، نواب جنجیرہ اور مہاراجہ کلیسہ کے علاوہ دوسرے امراء اور جاگیردار بھی شامل تھے یہی نہیں بلکہ "آفتاب" کا حلقۂ اشاعت ہندوستان سے باہر تک پھیلا ہوا تھا چنانچہ ایک منظوم اعلان میں ان ممالک کے نام گنائے گئے ہیں، جہاں یہ پرچہ جاتا تھا۔

چین، افریقہ اور جاپان — تھوڑی سی عمر میں یہ جا پہنچا
چشم بد دور دن بدن ہے بلند — ابھی یہ کہتا نہیں ہے یا مند
غیرسے الیسٹ پرشیا اس کا — امرکہ، سیلیبز اور جاوا

(جولائی ۱۹۲۰ء)

محض "والے درمے" ہی نہیں! بلکہ مہاراجہ کو "آفتاب" سے "لکھنے اور سخنے" بھی کافی دلچسپی تھی۔ اس دوسرے دور کے جتنے پرچے میرے سامنے ہیں ان سب میں مہاراجہ کے سلسل مضامین بالاقساط چھپے ہیں۔ مہاراجہ کے یہ مضامین اردو نثاری ہی کے کامیاب نمونے نہیں ہیں بلکہ معلوماتی حیثیت سے انھیں اردو ادب میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ یہ معلومات زیادہ تر سائنس کے ان زاویوں سے تعلق رکھتے ہیں جو پہلی جنگ عظیم تک انسانی ذہن شعور کے ... کے ...

جس زمانے میں "آفتاب" اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اردو زبان کے ادیب مختلف حلقوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے، گنے چنے چند لکھنے والے تھے جن کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ہر رسالہ اور اخبار کوشاں رہتا تھا۔ آغا شاعر اپنی ہندوستان گیر شہرت کے لحاظ سے اس حلقے سے کافی قریب تھے چنانچہ آفتاب کے لکھنے والوں میں اس عہد کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہو جو شامل نہ ہو۔ خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، آغا حیدر دہلوی، علامہ برج موہن کیفی دتاتریہ، علامہ نظم طباطبائی، احسان اللہ خاں گور کھپوری، ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی، ریاض خیرآبادی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، رضا علی وحشت، قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری، عزیز لکھنوی، نوح ناروی، اسمٰعیل میرٹھی، مہاراج بہادر برق دہلوی اور پیارے لال رونق دہلوی وغیرہ۔

صحافتی ترتیب کے اعتبار سے آفتاب بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح حصۂ نثر اور حصۂ نظم میں تقسیم تھا۔ ہر شمارے میں تین عنوان مستقل تھے۔ "پہلی کرن" جسے "افتتاحیہ" کہنا چاہئے اور "تصوف الرشاد" جس میں دوسروں کے مضامین، تیسرا "دھوپ چھاؤں"۔ حصۂ نظم میں عام طور سے غزلیں، نظمیں یا اور ایسی ہی شعری تخلیقات! آخر میں چند صفحات "معمولی کاغذ" پر ہوتے تھے جن میں رسالے کے اغراض و مقاصد اور اسی قسم کی بعض چیزوں کے علاوہ اشتہارات شائع کئے جاتے تھے۔ رسالے کی ضخامت عام طور سے چھتیس صفحات ہوتی تھی سرورق اور معمولی صفحات کے علاوہ۔!

اس دوسرے دور (سنہ ۱۹۲۰ء) کے جو دس شمارے میرے پیش نظر ہیں ان میں مارچ سنہ ۱۹۲۱ء کا شمارہ پہلا پرچہ ہے جس پر جلد ۵ شمارہ ۱۳-۱۴ چھپا ہوا ہے۔ اس نمبر میں ایک خاص مضمون "توپ" مہاراجہ جماماپائن کا ہے دوسرا خواجہ حسن نظامی کا۔ نظم کے حصے میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، اکبر الہ آبادی، پروفیسر مہدی حسن ناصری اور مرزا عاشق حسین بزم اکبرآبادی وغیرہ کی غزلیں ہیں۔

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء سے اس کی دوسری جلد بدل گئی لیکن اس جلد نمبر پانچ پر شمارہ نمبر ایک کے بجائے "چار" پڑا ہوا ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس مہینے کے مضامین میں سب سے اہم مضمون "اردو کی انشاء اور جدیدیت" علامہ کیفی دہلوی نے ان رجحانات کی مخالفت کی ہے جو اردو زبان میں "وضع اصطلاحات" کی تحریک کے تحت غیر مانوس الفاظ کو شامل کرنے کے موید تھے۔ علامہ کیفی کا نظریہ یہ تھا کہ اردو زبان میں جو الفاظ جس طرح پر زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں انھیں بدستور اپنی جگہ پر قائم و برقرار رکھا جائے خواہ وہ عربی سے لئے گئے ہوں یا سنسکرت، فارسی یا اور کسی زبان سے۔ اس سلسلے میں علامہ کیفی نے حیدرآباد دکن کی "تحریک وضع اصطلاحات" کو اردو زبان کی ترقی میں ایک طرح سے رکاوٹ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں علامہ کیفی:-

"ابھی تھوڑا عرصہ ہوا "عثمانیہ یونیورسٹی" سے مختلف شعبوں کی ترتیب و تدوین کی ذیل میں اصطلاحات علوم طبعیات کے متعلق حیدرآباد (دکن) میں بڑی بحث ہوئی۔ ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر (نظم) طباطبائی جدید یار جنگ تھے! آپ باوجودیکہ عربی فارسی کے جید عالم ہیں۔ لیکن آپ کے قول یہ تھا کہ اگر ایک لفظ انگریزی کا ایک کے لئے مقرر ہے تو اسی کو اردو میں استعمال کرنا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ عربی کا ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے... ہندی والوں نے بڑی عقل مندی کی۔ پنڈتوں کی ایک ناگری اور بہت سے اصطلاحی لغت یا ترکیبیں جن کی آواز کانوں کو ناگوار نہ تھی اور جن کا قائم مقام غیر مانوس سنسکرت لغت یا فقرہ تھا ان کے تئیں اپنی علمی فرہنگ میں داخل کر لیا۔" (بحوالہ ہندی سائنٹفک گلاسری، مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس)

علامہ کیفی کا یہ مضمون آج سے چالیس برس ادھر کے منصفانہ لسانی نظریات کا ترجمان ہے سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی انجھی ہوئی لسانی گتھی سلجھانے کے لئے اگرچہ آج بھی باتیں اسی قسم کی جاتی ہیں۔ مگر عمل اس کے برعکس! آج نہ گاندھی جی کے لسانی نظریات کی کوئی اہمیت ہے نہ خود ناگری پرچارنی سبھا اپنے نظریات کی پابند! آزادی کے بعد تو ہندوستان میں جو زبان جنم دی جا رہی ہے اسے تو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو بزعم خود اس کے "خالق" ہیں۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

(اقبال)

ہماری زبان

۱۵ر جنوری ۱۹۶۳ء

ہمارے مشاعرے

جب کوئی غیر ملکی ہمارے کسی مشاعرے میں شرکت کرتا ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ مغرب میں شاعر اپنا کلام رسالوں میں چھپواتا ہے یا پھر مجموعے کے ذریعہ سے ادبی حلقوں سے روشناس ہوتا ہے۔ کبھی کبھار دوستوں کو اپنی نظمیں سُنا لیتا ہے یا کسی ادبی حلقے میں اُسے چند سامعین مل جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور پاکستان میں ہر مشاعرے میں کئی درجن شاعر جمع ہوتے ہیں اور کئی ہزار آدمی بڑے ذوق و شوق سے اُن کا کلام سُنتے ہیں اور خوب خوب داد دیتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں پر ان سب باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ ہمارے شعرا پر رشک کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے سننے والے [illegible] اتنی بڑی تعداد کو متاثر کر سکتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھا جائے تو آج کل کے مشاعروں میں شاعری کے کمال کا کم اور گلے بازی یا ایک صاحب کے الفاظ میں چٹ پٹے شعروں کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک طرف ہمارے شاعر ہیں جو زیادہ تر غزل کی ایمائی زبان برتتے ہیں حالانکہ سُننے والوں کا بڑا حصہ اس لطیف دنیا سے بے بہرہ ہوتا ہے، دوسری طرف سُننے والے شعر سُننے کم آتے ہیں، وہ گانا سُننے آتے ہیں یا فلم دیکھنے کے بجائے مشاعرے میں شرکت کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسے اشعار سے دل چسپی ہوتی ہے جن میں حسن و عشق کے ترانے گائے جائیں یا سیاسی موضوعات جذباتی انداز میں پیش کئے جائیں، مشاعروں کا انتظام کرنے والے، شعر و ادب سے زیادہ سیاسی یا سرکاری مقاصد سے سروکار رکھتے ہیں، وزیروں کے لئے عوام سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے وزیر ہمیشہ اس کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کسی کتب خانے کی عمارت بننے کے موقع پر، یا کسی قومی رہ نما کے جنم دن پر صدارت کر دیں، یا کسی مشاعرے یا کوی سمیلن کا افتتاح کر دیں۔ افتتاح کے موقع پر اُردو شاعری کی کچھ تعریف بھی ہو جاتی ہے، کچھ اُردو زبان کی شیرینی کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے۔ جلسے والے ان کلمات کو تبرک سمجھ کر جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ ہم اُردو والے انہیں کو پڑھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ صدر بھی عام طور پر کوئی وزیر یا سرکاری افسر ہوتا ہے اور اگر بدقسمتی سے اُسے اُردو شاعری سے دلچسپی ہے تو پنجے کے افسر ہر نمائش کے موقع پر، ہر عُرس میں، یوم آزادی پر، کسی تہوار کے سلسلے میں مشاعرہ ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عام طور پر کسی کام کے لئے اُس سے حقیقی دل چسپی ضروری نہیں، ہاں اگر اس کام سے آئندہ کچھ ذاتی نفع کی امید ہو تو وہ کام ضرور کیا جاتا ہے۔ غرض ایسے ایسے مشاعرہ بازوں کی وجہ سے ان مشاعروں کی خاصی مٹی پلید ہوتی ہے۔ پھر وہ شعرا جو کچھ مشہور ہو گئے ہیں، ان مشاعروں میں اپنی پُرانی اور بار بار کی پڑھی ہوئی غزلیں یا نظمیں پڑھتے ہیں۔ ہر شاعر یہ خیال رکھتا ہے کہ دوسرا مقبول نہ ہونے پائے۔ کچھ شاعر مشاعرے میں شرکت کرنے آتے ہیں تو شاعری کے ساتھ اپنے اخلاق کا مظاہرہ بھی کرتے چلتے ہیں۔ اُن کے معمولات عین محفل میں پورے ہونے چاہئیں ورنہ وہ خفا ہو جائیں گے یہ معمولات ایسے ہوتے ہیں جن پر بہت سے لوگوں کو بجا اعتراضات ہوتے ہیں۔ آج کل کے سامعین میں خواتین خاصی تعداد میں ہوتی ہیں اور کچھ شاعرات اپنا کلام بھی سُناتی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے مگر ان کی موجودگی میں جس سنجیدگی اور تہذیب کی ضرورت ہے اُس کا لحاظ کم ہی رکھا جاتا ہے۔ یار لوگ فقرے کستے ہیں۔ کبھی کبھار کچھ شعرا بھی ایسی نظمیں پڑھتے ہیں جو کسی طرح مناسب نہیں کہی جا سکتیں۔ پھر سامعین کا بڑا حصہ فارسی سے بالکل ناواقف ہوتا ہے اور اُردو شاعری کی زبان پر اب بھی فارسی کا گہرا اثر ہے۔ ترکیبیں، تلمیحیں، تشبیہیں، استعارے، اکثر فارسی کی کچھ [illegible] ہے۔ ان سب باتوں سے [illegible] مشاعروں میں سُننے والوں کی تعداد تو بڑھ رہی ہے [illegible] افادیت کم ہو رہی ہے اس لئے ان کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

ہمارے خیال میں اب ہر مشاعرہ ٹکٹ سے ہونا چاہئے۔ جو لوگ اچھے شعر سُننے چاہتے ہیں وہ اس کی مناسب قیمت ادا کریں۔ مشاعروں میں شاعروں کی تعداد ہمیشہ منتخب ہونی چاہئے۔ یہ اگر بیس پچیس سے زیادہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ یہ تین گھنٹے سے زیادہ نہ چلیں تو بہتر ہو۔ ان کا صدر ادبی حیثیت رکھتا ہو۔ شعرا کا تعارف کرنے والے سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں اور خواہ مخواہ فقرے بازی سے کام نہ لیں۔ شعرا جہاں تک ہو سکے تازہ کلام سُنائیں۔ اُن لوگوں کی ہمت افزائی نہ کی جائے جو شعر بہت معمولی کہتے ہیں ہاں کواِلیت اچھا پاتا ہے۔ وہ بھی قابل قدر ہیں مگر ان کی جگہ دوسری ہے۔ شاعر بدلتی ہوئی دنیا کا شعور پیدا کریں اور ایسی زبان استعمال کریں جو سامعین کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اُس سے لطف لے سکیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بول چال کی زبان میں شعریت نہیں ہے۔ ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں فرق تو ہوتا ہے مگر جتنا فرق ہمارے یہاں ہے وہ ہماری شاعری کو مقبول نہیں ہونے دیتا۔ اچھا مشاعرہ منتظمین کے سلیقے، شعرا کے ذمہ داری کے احساس اور سامعین کے ضبط و نظم و تہذیب سے وجود میں آتا ہے۔

اُردو دوستوں کے پاس عوام سے تعلق کا یہ ایک اچھا آلہ تھا۔ ہم اپنی غیر ذمے داری کی وجہ سے اسے مسخ کر رہے ہیں۔ ابھی اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر اب بھی توجہ نہ کی گئی تو یہ قوالی اور دنگل کی قسم کی ایک سستی تفریح ہو کر رہ جائے گا۔ ادب کی بنیاد تہذیب پر ہوتی ہے اور اسی لئے اس ادبی ادارے کو ایسی مسرت کا گہوارہ ہونا چاہئے جو اپنے ساتھ بصیرت بھی لائے اور جو سننے والوں کے جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی شعور کو بیدار کرے۔ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے کون کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن مستقر شکر نگر کے قائم کردہ دارالمطالعہ میں چار ماہانہ رسالے، اٹھارہ پندرہ روزہ، پانچ ہفتہ وار، ایک سہ روزہ اور چار روزنامے آتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۲ء کے دوران میں بودھن و شکر نگر کے (۵۵۰) افراد نے ان اخبار و رسائل اور کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ (معتمد)

"اُردو مجلس" حیدرآباد

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی جلسہ ۱۰ر جنوری کو اُردو ہال میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ ایم پی [illegible] سابق گورنر [illegible] کی صدارت کی۔ مسٹر محمد منظور احمد معتمد اعزازی اُردو مجلس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی گل پوشی کی۔ اس ادبی اجتماع میں ممتاز مزاح نگار شاعر مرزا شکور بیگ کے مجموعہ کلام "ترانے" کی رسم اجرا ڈاکٹر بی رام کشن راؤ کے ہاتھوں انجام پائی۔

پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد نے "مرزا شکور بیگ" کے زیر عنوان اپنے دل چسپ مضمون میں کہا کہ "مرزا ایک شگفتہ مزاج شاعر اور جوان ظریف ہی نہیں ایک باراں دیدہ وکیل بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی وکالت اور قانونی موشگافیوں نے ان کی ظرافت اور شاعری میں چار چاند لگا دیئے۔ اپنی شگفتہ مزاجی کے باوصف مرزا شکور بیگ ایک حساس اور سنجیدہ فن کار ہیں۔ ان کی نشتر کاری میں اکبر الہ آبادی کی طرح تیکھا پن ملتا ہے۔ اور اکبر کی طرح مرزا بھی ایک خاص قسم کی ملمع کاری بھی خوب کرتے ہیں۔ اور افرنگی شبدوں کو اُردو کے خراد پر بڑے ہی سلیقے سے چڑھاتے ہیں۔"

صدر جلسہ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ نے مرزا کے فن اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "مرزا شکور بیگ اور میں لیڈری اور پلیڈری سے لے کر اداکاری کے کاموں میں بھی ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ان کی شگفتگی طبع اور ظرافت نے اسمبلی کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ہم سبھوں کو محظوظ کیا ہے۔"

ابتدا میں کرسی صدارت سے حیدرآبادی تہذیب کے علم بردار اور اُردو سے والہانہ محبت رکھنے والے راجہ پرتاب گیر جی کے سانحہ ارتحال پر ایک قرارداد تعزیت پیش کی گئی جسے حاضرین نے استادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کیا۔

(وقار خلیل)

انجمن معین الادب سہسرام

انجمن معین الادب سہسرام کا ماہانہ جلسہ زیر صدارت سید عبدالسلام افسر سہسرامی منعقد ہوا جس میں اراکین انجمن نے مقامی رام اجین کنیا ہائی اسکول اور ہزاری مل رنگٹا مڈل اسکول کے طریقۂ امتحانات پر اظہار افسوس کیا کہ امتحانات کے سوالات صرف سخت ہندی زبان اور رسم الخط ہی میں چھپتے ہیں جن سے ان طلباء و طالبات کو جن کی مادری زبان اُردو ہے سوالات کو سمجھنے اور ان کے جوابات لکھنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

ہندوستان کے دستور نے لسانی اقلیتوں کو یہ حق عطا کر رکھا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ انجمن کے خیال میں سوالات کا صرف ہندی زبان میں چھپنا اس حق کی نفی ہے۔ اس لئے یہ انجمن پرزور الفاظ میں مطالبہ کرتی ہے کہ آئندہ سے امتحانات کے سوالات اُردو زبان میں بھی چھپیں۔

(تمنا سہسرامی)

پیسہ پیسہ آپ بچائیں !
دیش کی طاقت اور بڑھائیں

رسالہ جامعہ کا جائزہ نمبر

ماہنامہ جامعہ کا جائزہ نمبر اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہوگا، اس میں ۱۹۶۲ء کی اُردو مطبوعات کی فہرست شائع کی جائے گی اور تمام اصناف ادب کا الگ الگ جائزہ لیکر بتلایا جائے گا کہ ۱۹۶۲ء میں اُردو ادب کی رفتار ترقی کیسی تھی۔

(عبداللطیف اعظمی)

متجر سہسوانی کا انتقال

۹ر اور ۱۰ر جنوری کی درمیانی رات میں سہسوان کے ممتاز عالم، ادیب و شاعر حکیم سید اعجاز احمد صاحب متجر کا انتقال ہو گیا، ان کی پیدائش ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک وثیقہ عربک کالج فیض آباد کے وائس پرنسپل رہے۔ انھوں نے پچاسی سال کی زندگی میں تقریباً ایک درجن مذہبی و ادبی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ "متجر نما" دو ناول "پردۂ راز" اور "جاریۂ عرب" تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نقد و انتقاد" اور "مومن و غالب" کے نام سے دونوں اساتذہ کے کلام کا ایک موازنہ وغیرہ آپ کے ان کارناموں میں شامل ہیں جو چھپ چکے ہیں۔

(حنیف نقوی سہسوانی)

علی افسر حیدرآباد

قومی دفاعی فنڈ

میرے جذبات صداقت کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے الفاظ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
دلِ شاعر میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
مال و زر ہوتا وطن کے لئے میں بھی دیتا
خونِ دل اپنا چمن کے لئے میں بھی دیتا
میں تہی دست سہی خونِ جگر دیتا ہوں
اپنا فن، اپنی نظر، اپنا ہنر دیتا ہوں
ست امروز کو فردا کی خبر دیتا ہوں
دشمنِ امن و اماں تاک میں بیٹھا ہے ابھی
ایک شعلہ خس و خاشاک میں بیٹھا ہے ابھی
کس بھلائی کی توقع کریں مکاروں سے
مل گیا ہم کو سبق چین کے عیاروں سے
مجھ کو کہنا ہے یہ بھارت کے پرستاروں سے
ایک للکار ابھی وقت کی آواز میں ہے
دوستو! جنگ ابھی منزلِ آغاز میں ہے
فرض ہے ہم پہ کریں آج وطن کی خدمت
اپنے ہی ہاتھ میں ہے اپنے وطن کی عزت
وقت کے بعد نہ کام آئے گی اپنی دولت
ملک پر اپنا زر و مال نچھاور کر دیں
بھائیو! ہند کا پھیلا ہوا دامن بھر دیں
اب نہ حاجت ہے فصیلوں کی نہ دیواروں کی
جنگ یہ جنگ نہیں ہے کوئی تلواروں کی
ٹینک درکار ہیں اب مانگ ہے طیاروں کی
اپنی فوجوں کو لڑانے نئے ہتھیار ہوں اب
سونے والوں سے یہ کہنا ہے کہ بیدار ہوں اب
جنگ بندی ہے صداقت کہ بہانہ دیکھو
یہ حقیقت بھی ہے یا کوئی فسانہ دیکھو
آگے کس راہ پہ چلتا ہے زمانہ دیکھو
چلنے والے تو چلے چاند ستاروں کی طرف
اور ہم دیکھ رہے ہیں ابھی غاروں کی طرف
دعوت لے ہند کہ اب ہوش میں آنا ہے ہمیں
لاؤ، ذرا لا یہ حق اپنا جتانا ہے ہمیں
ملک کو پنجۂ دشمن سے بچانا ہے ہمیں
زور دار ہو تو ہر اک فرض ادا ہوتا ہے
صرف جے کار سے تائید سے کیا ہوتا ہے
امن دشمن کے تسلط کو ہٹانے کے لئے
مادرِ ہند کی عزت کو بچانے کے لئے
مال و زر چاہیے طاقت کو بڑھانے کے لئے
آج ایثار کرو گے تو صلہ پاؤ گے
ورنہ تم صفحۂ تاریخ سے مٹ جاؤ گے

رحمٰن جامی

اہلِ طوفاں

زندگی کے طوفاں میں کب سے ہوں تہ و بالا
اب مجھے کنارا بھی دور ہی سے تکتا ہے
جی میں یوں بھی آتا ہے تہ میں ڈوب ہی جاؤں
رات دن کی وحشت سے جاں تو چھوٹ جائے گی

لیکن ایسے لمحوں میں مجھ کو بے کراں موجیں
ناز و دلربائی سے لطف اور عنایت سے
بانہوں پر اٹھاتی ہیں دور لے کے آتی ہیں
اور چٹان کے ساحل پر مضحکہ اڑاتی ہیں

سوچتا ہوں طوفاں ہی مجھ کو راس آیا تھا
جیسے ہر صدا پر تھیں میری ہم نوا موجیں
لیکن اب میں ساحل پر یوں بھٹکتا پھرتا ہوں
جیسے کوئی آوارہ ایک عاشقِ رسوا

لو مجھ کو اے موجو پھر اٹھا لو بانہوں پر
اب مری یہی ضد ہے زندگی سے ٹکراؤں
خود اٹھاؤں اک طوفاں دیکھوں کس کا نظارہ
اب مجھے کنارہ بھی غیر غیر لگتا ہے

غزلیں

مسعود اختر جمال

یونہی چپکے چپکے روتا، یونہی دل پہ دل میں باتیں
بڑی کشمکش کے دن ہیں، بڑی الجھنوں کی راتیں
ہے نفس نفس فروزاں، ہے مژہ مژہ چراغاں
بڑی دھوم سے اٹھی ہیں غم و درد کی براتیں
مرے ذہن کے خلا میں، مرے دل کی وسعتوں میں
کہیں رنگ و بو کے خیمے، کہیں نور کی قناتیں
انہیں اے غمِ زمانہ کبھی رائیگاں نہ کرنا
یہ بہت لطیف و نازک غمِ دل کی وارداتیں
یہ جمال میکدہ ہے، نہیں یاں کوئی تکلف
نہ عرب عجم کے جھگڑے، نہ حسب نسب نہ ذاتیں

گووند پرشاد

اے جانِ تبسم تری معصوم ادا نے — اب ہائے زمانہ یہ تراشے ہیں فسانے
ممکن ہے کہ اب آپ کو میں دل سے بھلا دوں — [illegible]
شاید ہے زمانوں کو گنا ہوں نہ تری یاد
[illegible]

بقیہ: ماہنامہ آفتاب

علامہ کیفی کے اس مضمون کے علاوہ مہاراجہ کے اسی مضمون (توپ) کی بقیہ قسط اور ایرانی سفیر نواب نصیرالملک کے سفرنامۂ لیلی کی ایک قسط بھی ہے۔ حصۂ نظم میں اکبر الٰہ آبادی کے دو قطعے، اور ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم "آفتاب حقیقت" ! جو "رگ وید" کی مشہور دعا گاتری" کا ترجمہ ہے۔ اس اردو نظم میں دس شعر ہیں۔ ان کے علاوہ "حضرت دل" قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری کی ایک نظم اور قتیل سسند بلوی کی ایک فارسی نظم بھی ہے۔

مئی ۱۹۲۲ء کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱- پہلی کرن - یاد وطن ۔ آغا شاعر (ایڈیٹر)
۲- دربار جوبلی
ہو بقصد اظہار داس ہاتھ سے اس ہاتھ لے ، راشد الخیری دہلوی۔
۴- دیس اچھا یا پردیس ، سید سجاد حیدر یلدرم۔
۵- گوشۂ کلاہ دہقاں بر آسماں رسید ۔ آغا شاعر (ایڈیٹر)
۶- توپ ، مہاراجہ جھالراپاٹن۔
۷- دھوپ چھاؤں - دو خط - نذیر احمد خاں صاحب بی ایس سی
۸- سکۂ زر - آغا شاعر دہلوی

حصۂ نظم میں اکبر الٰہ آبادی کی نظم "مغربی پھول" کے دس اشعار، اور دوسرا قطعہ ڈاکٹر اقبال کا ہے جو "علی برادران" کی رہائی پر کہا گیا تھا اس قطعہ میں صرف چار شعر ہیں۔

سے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام وقفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کیں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

غزلوں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، جلیل، ریاض، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی اور خود آغا شاعر کی غزل شامل ہے۔ فصاحت یار جنگ جلیل کو "مانک پوری" کے بجائے "لکھنوی" اور "ریاض خیرآبادی" کو "گورکھپوری" لکھا گیا ہے۔

آغا شاعر کا مضمون "یاد وطن" دلی کی بامحاورہ اردو کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

جون ۱۹۲۲ء کے شمارے میں نظم طباطبائی، سجاد حیدر یلدرم، احسان اللہ خاں گورکھپوری اور خود آغا شاعر کے تین مضامین شامل ہیں۔ آغا شاعر کا مضمون "مغربی روشنی میں اردو کا دور جدید" اردو ادب کی تاریخ کا ایک کامیاب تجزیہ ہے۔

"دور ششم" کے چند سرسری خاکے ملاحظہ ہوں:-

"یہی وقت تھا جب علی گڑھ میں سر سید احمد خاں جیسا کوہ شکن انجینیر جہاں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا چاہتا تھا وہیں وہ اردو کی نئی داغ بیل بھی ڈال رہا تھا۔ بیل اور سرچشمے قائم ہو رہے تھے نواب محسن الملک، شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی علامہ شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد خاں، ایل ایل ڈی اور مولوی ذکاء اللہ خاں جیسے مورخ و سخن طراز اپنے ہم بزم و ہم خیال تھے۔ جہاں جو "تہذیب الاخلاق" کے صفحے رنگے جانے لگے اور ان بزرگوں کی گراں مایہ اور عدیم المثال تصانیف سے اردو کا خزانہ مالامال ہو گیا ۔۔۔ نظم کا میدان اس زمانے میں جہاں استاد جلیل ہندوستان نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی، منشی امیر احمد صاحب مینائی، حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی، حکیم ظہیر مجروح منشی امیر اللہ تسلیم اور شہزادہ رشید گورگانی تک وسیع ہو گیا تھا۔ مذہبی واقعہ نگاروں میں میر نفیس، اعلیٰ اللہ مقامہ جناب مرزا اوج، جناب عروج اور جناب رشید مرحوم یادگار ناظم مانے گئے۔"

"زندہ دلان پنجاب" کے تحت اسی مضمون میں پنجاب کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے:-

"یہ لوگ مغربی علوم کی جھلکیاں دیکھ ہی چکے تھے اب مشرقی رنگ کو بھی سمو لیا اور دو آتشہ جام ہر گلی کے دور پر دور چلنے لگے۔ ہاں البتہ اگر ان میں کچھ کور کسر تھی تو صرف اتنی ہی کہ اردو کے ٹھیٹ محاورات سے نا واقفیت موقع اور محل سے نابلد، تذکیر و تانیث سے اجنبی، اونچی پونجی اور شوق زیادہ، مگر ہمت کا قدم آگے تھا اس لئے کسی کی پروا نہ کی۔ شارٹ ہینڈ (Short handed) ہو نا قبول کیا مگر کام کرتے ہی گئے۔ مختصر وقت مدرس و تدریس سے افہام و تفہیم کی منزلیں طے کرتے ہوئے اخباری معلومات پر قادر ہو گئے۔ رسائل نگاری شروع کر دی۔ آخر اس طوفان کا یہاں تک دل بڑھا کہ ایک اکیلے لاہور سے صرف ایک وقت میں ایک سو اخبار اور رسالے نکلنے لگے اور مخزن جیسی ناشر و ناظم برسات کی روئیدگی کی طرح کان پر قلم رکھے ملک میں جہاں تہاں گشت لگانے لگے ۔۔۔ یہ قاعدے کی بات ہے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ انھیں میں سے ایک، کہ نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹی ایسی بھی نکل آئی جس نے حقیقت کو پہچان لیا اور ضرورت زمانہ کے موافق ادب اردو کی ترقی کے لئے "مخزن" جیسا میگزین نہایت قابلیت اور خوب صورتی کے ساتھ جاری کر دیا۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر بی اے اس کے راس الرئیس بنے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال ایم اے

مضمون خاص کے جذبے سجادہ ، افتتاحیہ ، تبصرہ ، صحافتِ حاضرہ وغیرہ اور نظم کا رنگ دے ۔

برنگِ شاخ گل ہی کلائی

کلام قوم ہے خواہ بیچوں قاتل ہے

جہاں جہاں جاری ہوگئی اور ساری دنیا اسی رنگ میں شعر اور نثر آنے لگی آخر نظم و نثر کا یہ تموّج خدا کی زمین اور "زمیندار" کی پیٹھ پیٹھ سے گذرتا ہوا "بے آف بنگال" سے جا ٹکرایا ۔ اور خاص کلکتہ میں جہاں عبدالغفور خاں شساخ کا جمِ جوم تھا ۔ وہیں ہی ایک جلیل القدر ہستی ۔ ایک لاثانی دماغ کے مالک ہمارے ایک محترم دوست کو بادعائے فضل و کمال و بہ ثبات ہوش و حواس بھی مختل کر دیا ۔ یعنی آپ خاص اہلِ زبان ہونے اور دلی کے روڑے کہلانے پر بھی خیر سے اسی رنگ میں رنگ گئے ۔ چنانچہ "الہلال" چمکا ۔ "البلاغ" نے دور دور پیام بری کی ۔ اور باوصف ہمہ دانی خدا جانے کیا جاتی دنیا دیکھی کہ آپ نے بھی ادبِ اردو کے نازنین تن بدن کو عربی اخبارات کے غیر مانوس ترجموں کے "بوجھل مواد" سے بالکل بجا پھوڑا کر ڈالا ۔ بلکہ حسبی اللہ حسبی اللہ" بالکل ایک مکروہ ترین جذامی کی سی شکل پیدا کر دی ۔

آپ کے کثیر التعداد مقلد ادھر ہی چل پڑے اور ملک میں بنگالی اردو ، پنجابی اردو ، پوربی اردو ، اور مدراسی اردو کی دوکانیں جا بجا کھل گئیں ۔ چنانچہ "افتادہ" شذرات اور خدا جانے کیا کیا بلا از قسم نوردات آپکی آزادانہ تجدید کی اب تک گواہیاں دینے کو موجود ہیں ۔

(باقی)

جیسا حقیقت نگاری کا مدعا گاہ سید سجاد حیدر ملی وہ ریلدرم ، مولوی غلام بھیک نیرنگ وغیرہ جواں خیال و جواں اقبال نثر نگاروں سے ، سے چند ہی سال میں ماہواری دس ہزار نگاہوں سے گذار دیا ۔

"مخزن" کی تعداد اشاعت کے بارے میں آغا صاحب کی اطلاعات یقیناً مبالغہ آمیز نہیں کہی جا سکتیں ۔ کیونکہ "مخزن" اور سر عبدالقادر سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے ۔ آغا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "تیر و نشتر" سنہ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ "مخزن" ہی نے شایع کیا تھا ۔ "آفتاب" کا یہ دلچسپ مضمون جون سے اگست سنہ ۱۹۲۰ء تک مسلسل تین قسطوں میں چھپتا رہا جولائی کے شمارے میں اردو ادب اور صحافت کے نئے اُتار چڑھاؤ پر بہت ہی بچپر انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اور اس تنقید سے مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ مخصوص اسلوب نگارش بھی نہ بچ سکا جو اس زمانے میں ایک خاص مکتبِ خیال کے لئے اجنبی ہی تھا ۔

بزرگوں کی عظمت جدید تعلیم کی نذر ہو ہی چکی تھی ۔ روکنے ٹوکنے یا بات کا دم بھرنے والا نام کو بھی کہیں نظر نہ آیا بس پھر کیا تھی ؟ کھلے بندوں جدت طرازیاں ہونے لگیں اور اردو غریب کو کُند چھری سے ریتنے کا فتوائے عام ہو گیا ! طبیعت میں جوانی کا زور ، دماغ جدید علوم سے معمور ، بازوؤں میں کام کرنے کی قوت ! آتے ہی اخباری دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک دھوم مچا دی ۔ بڑے بڑے پرانے "گر زبیدے ، اخبار نویس" چیخ اُٹھے اگر "مولانا" نے کسی کی ایک نہ مانی ، اور عربیت کے زور شور سے وہ گولے برسائے کہ ایک مدت مدید تک انھیں کے الفاظ کی آواز بازگشت کے طور پر دشت و جبل سے آتی رہی !

مولانا ظفر علی خاں ۔

انجمن کی مطبوعات

تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴٫۵۰	مقالاتِ حالی	مولوی عبدالحق	۳٫۲۵
ہندوستانی اخبار نویسی	محمد عتیق صدیقی	۱۲٫۰۰	یادگارِ حالی	بیگم صالحہ عابد حسین	۴٫۵۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد		۷٫۰۰	حیاتِ اجمل	قاضی عبدالغفار	۸٫۰۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲٫۰۰	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵٫۰۰
نقدِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو	۱۰٫۰۰	اردو صرف و نحو	مولوی عبدالحق	۱٫۰۰
محاسنِ کلامِ غالب	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری	۱٫۰۰	قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶٫۰۰
دیوانِ غالب	مرتبہ امتیاز علی عرشی	۲۰٫۰۰	گاندھی اور نہرو کی راہ	"	۵٫۰۰
غالب (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶٫۰۰	حالی کی ایک جھلک	بیگم صالحہ عابد حسین	۱٫۵۰
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵٫۵۰	نئے ڈرامے	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۵٫۰۰
ترقی پسند ادب	سردار جعفری	۳٫۷۵	نئی روشنی	محمد فضل الرحمٰن	۱٫۲۵
فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۳٫۰۰	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۲٫۲۵

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

دھرمیندر پرشاد سکسینہ بدایونی

پنڈت رام پرشاد بسمل

پنڈت رام پرشاد نام، بسمل تخلص شاہجہاں پور کے ایک معزز برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۹۷ء کے قریب مین پوری کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد ترک وطن کر کے شاہجہاں پور چلے آئے اور بسمل مرحوم کی نشو و نما شاہجہاں پور ہی میں ہوئی۔ آپ کے والد پنڈت مرلی دھر بھی اُردو شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اس لئے انھوں نے ابتدا میں بسمل کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ اوائل عمری میں بسمل نے اُردو فارسی کی تکمیل کر لی اس کے بعد انگریزی سکول میں داخل ہو گئے لیکن ہائی اسکول کا امتحان پاس نہ کر سکے لیکن انگریزی میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ شاہجہاں پور اس زمانے میں شعر و شاعری کا گہوارہ تھا۔ منشی سوہن لال حقیر شاہجہاں پوری، ناظم شاہجہاں پوری جگدیش سہائے شاہجہانپوری اور دل شاہجہانپوری کے نغموں سے اُردو دنیا گونج رہی تھی اس لئے آپ منشی سوہن لال حقیر کے شاگرد ہو گئے۔ منشی سوہن لال حقیر اپنے زمانے کے اُردو اور فارسی کے جیّد عالم اور شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان طبع ہو چکا ہے۔ حضرت جگر بریلوی نے بھی آپ سے مشورہ سخن کیا ہے بسمل کے سینے میں ایک درد مند دل تھا اس لئے ابتدا ہی سے وطن کی محبت میں سرشار تھے اور فرنگی کے راج کا بھارت سے خاتمہ چاہتے تھے کیونکہ آپ کا شروع ہی سے خیال تھا کہ وہ ملک جو غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی کہیں بھی عزت نہیں کی جاتی۔

آپ شروع ہی سے انقلابی خیال کے انسان تھے اسی لئے آپ نے اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ آزادی کی خاطر آپ نے ڈکیتیاں بھی ڈالیں لیکن کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مین پوری کے مشہور انقلابی لیڈر شری گیندن لال دیکشت کے ساتھ رہ کر آپ نے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کی مین پوری سازش کیس میں انگریزی حکومت نے آپ کو بھی گرفتار کرنا چاہا لیکن آپ ہاتھ نہ آئے اور (Royal proclamation) کے بعد آپ شاہجہاں پور آ کر پھر ملک اور قوم کی خدمت میں لگ گئے۔

۹ر اگست ۱۹۲۵ء کو شام کے آٹھ بجے ٹرین ہردوئی سے لکھنؤ جا رہی تھی، اچانک کرانت کاریوں نے کاکوری اور عالم نگر کے درمیان ۵۲ نمبر کے کھمبے کے قریب ٹرین کو روک لیا اور انگریزی گورنمنٹ کے خزانے کو لوٹ لیا لیکن کسی ہندوستانی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء سے گرفتاریاں شروع ہوئیں اور پنڈت رام پرشاد بسمل بھی گرفتار ہوئے اور ان کے دوسرے ساتھی بھی پکڑے گئے۔ ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلتا رہا، اور عدالت نے آپ کو پھانسی کی سزا دی، اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں آپ کو پھانسی کے تختے پہ لٹکا دیا گیا۔ کاکوری سازش کیس کی پیروی اُردو کے مشہور شاعر پنڈت ہرنرائن علامہ کیفی اور پنڈت ہرناتھ ملا گوبند بلبھ پنت کی طرف سے کر رہے تھے۔

پھانسی سے ایک دن پہلے بسمل اپنی والدہ سے ملے اور اُن کو دیکھ کر رو پڑے کیونکہ بسمل کا خیال تھا کہ اُن کی والدہ کا مدد کرنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ ماں نے کڑک کر کہا کہ ساری زندگی ملک کے لئے آنسو بہاتے رہے اب آخری وقت میرے لئے روتے ہو۔ بسمل نے جواب دیا کہ اگر موم کو آگ کے پاس لایا جائے تو اُس کا پگھلنا ضروری ہے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح سندھیا سے فارغ ہو کر فوراً اپنی والدہ کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنے ہم وطنوں کے نام ایک پیغام بھیجا اور پھانسی کے انتظار میں کال کوٹھری میں بیٹھ گئے۔ جیسے ہی جیل کے افسر آپ کو پھانسی کے لئے بلا دے کے لئے آئے تو بندے ماترم اور بھارت ماتا زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے فوراً چل دے چلتے وقت انھوں نے کہا۔ ؎

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے
جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے
تیرا ہی ذکر یار تری جستجو رہے

پھانسی کے دروازے پہ پہنچ کر انھوں نے کہا:-

"I wish the down fall of British Empire"

اس کے بعد پھانسی کے تختے پہ کھڑے ہو کر کہا۔ ؎

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت بس دل بسمل میں ہے

اُردو ہی ہندوستان کی وہ ترقی یافتہ زبان ہے جس کے بیسیوں شاعر پھانسی کے تختے پر لٹک گئے آزادی کی لڑائی میں اس زبان نے بڑا کام کیا ہے۔ ہم کو اس زبان کو زندہ رکھنا ہے کیونکہ یہ زبان رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ حسرت، راجیندر لہری، لالہ لاجپت رائے اور سردار بھگت سنگھ جیسے وطن پرست شہیدوں کی زبان ہے۔ عالی جناب آل احمد سرور نے اپنی نظم اُردو میں کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں کی تیرگی میں دیئے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فرازِ دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی کے گیت گائے
کہا ہے کس نے کہ ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھین جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے

پنڈت رام پرشاد بسمل کی مشہور انقلابی غزل ملاحظہ فرمائیے، جسے سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی اپنے مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے کمرۂ عدالت میں گایا کرتے تھے :-

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہ روِ راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دورئ منزل میں ہے
یوں کھڑا مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار
کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے؟

(باقی صفحہ ۹ پر)

لسانی اقلیتی کمشنر سے انجمن ترقی اردو راجستھان کے وفد کی ملاقات

۲۰ دسمبر ۷۲ء کو انجمن ترقی اردو راجستھان کا وفد زیر قیادت الطاف احمد صاحب خیری صدر انجمن ترقی اردو راجستھان لسانی اقلیتی اسسٹنٹ کمشنر (الہ آباد) شری ڈی۔ این۔ باجپئی سے جے پور میں ملا۔ ارکان وفد میں احترام الدین احمد صاحب شاغل، ڈاکٹر سردار رام سنگھ خازن، منشی رامسورو لال ناظر، گلاب خاں صاحب نائب صدر، انجمن نزاہدہ، فرید بخش صاحب نمائندہ انجمن کراہ، ظہور الدین صاحب نمائندہ انجمن بانسی، پیرجی عبدالصمد فاروقی نمائندہ جھنجھنوں شامل تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب مذکور کے علاوہ اسپیشل آفیسر صاحب لسانی اقلیات راجستھان اور ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب تعلیمات ریاست راجستھان بھی موجود تھے، نہایت خوشگوار فضا میں حسب ذیل موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اور رفع شکایات کا یقین دلایا گیا۔

تعلیم

وفد نے تسلیم کیا کہ باوجود صاف حکم گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ راجستھان جولائی ۱۹۵۸ء سے آج تک مقررہ شرائط ۱۰ طلبہ فی کلاس یا ۴۰ طلبہ فی اسکول کی موجودگی کے کسی ایک اسکول پر بھی ابتدائی درجات (از درجہ اول تا درجہ پنجم) میں پورے مضامین اردو میں ۱۴ سال گزر جانے کے باوجود جاری نہیں کئے گئے نہ ذریعہ تعلیم کسی ایک بھی اسکول میں اردو کو قرار دیا گیا نہ نصاب میں بجز ریڈروں کے کسی دوسرے مضمون کی کتاب نامزد کی گئی، اگرچہ گورنمنٹ راجستھان ۱۹۵۸ء ہی میں یہ حکم دے چکی ہے کہ اگر راجستھان میں اردو کی کتابیں نہ ہوں تو قریبی ریاستوں سے لی جائیں۔ وفد نے بطور نمونہ ایک مختصر سا گوشوارہ بھی پینتیس اسکولوں کا ایسا پیش کیا جن میں زیادہ تر ہر دو شرائط پوری ہوتی ہیں اور بہت سی جگہ سو فی صد طلبہ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہی ہے اور بلحاظ تعداد بہت سے اسکولوں میں طلبہ کی مجموعی تعداد سو سے اوپر ہے بلکہ ایک میں تو چار سو سے بھی زائد طلبہ ہیں۔ اگر انجمن کی تمام شاخوں سے اعداد و شمار وقت پر آ جاتے تو ایسے اسکولوں کی تعداد کئی سو ہوتی تاہم اس مختصر گوشوارے کی نقل ہر سہ افسران نے طلب کی ہے اور امید ہے کہ ان میں آئندہ سیشن سے انتظام ہو جائے گا۔ اسی ذیل میں یہ بات بھی منجانب افسران کہی گئی کہ اب درخواست داخلہ میں جس کا نام گوشوارہ ہے یہ خانہ رکھ دیا گیا ہے کہ طالب علم کا سرپرست کس زبان میں تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دستور ہند کی رو سے اور احکام مجریہ کی رو سے درجہ اول سے درجہ پنجم تک بچے کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہئے پھر اگر خود سرپرست ہی اس بات کو نہ سمجھیں کہ مادری زبان کی تعلیم کے کس قدر فائدے ہیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ اس لئے اردو والوں کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فارم بھرنا یا بھروانا چاہئے کسی کے بہکانے یا غلط ترغیب دینے کا اثر نہ لینا چاہئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ایک رجسٹر ہر اسکول میں رکھوا دیا گیا ہے کہ کس زبان میں بچہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وفد کا کہنا تھا کہ ایسا رجسٹر مرتب نہیں کیا جا رہا ہے مگر ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب نے یقین دلایا کہ ایسے رجسٹر رکھوا دئے گئے ہیں۔ بہرحال تعلیمی زبان کا معاملہ اب سرپرستان کی مرضی اور دور اندیشی پر منحصر ہے۔ یہ بات کہ بچہ اردو پڑھے گا تو ہندی میں کمزور رہ جائے گا اور سرکاری زبان سے ناواقفیت باعث نقصان ہوگی قطعاً بے بنیاد غلط فہمی ہے۔ اس لئے کہ درجہ سوم سے ہندی کی تعلیم راجستھان میں لازمی ہے۔ پھر کمزوری کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ وفد نے ظاہر کیا کہ کئی جگہ جس سے مادری زبان کی تعلیم کے لئے شرائط پوری کرتے ہوئے درخواستیں دی جاتی ہیں مگر ماتحت افسران نہ توجہ کرتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں مثلاً نزاہدہ قصبہ کی ڈھانی بھر تولاد کا پرائمری اسکول جس میں کل ۷۶ طلبہ ہیں اور سب کی مادری زبان اردو ہے۔ درخواست پہ درخواست دی جاتی ہیں مگر متعلقہ افسر اردو جاری نہیں ہونے دیتے۔ بعض جگہ ہیڈ ماسٹر اردو کا ٹیچر نہ ہونے کا عذر کرتے ہیں، درآنحالیکہ ایک بڑی تعداد اُسی انسپکٹری میں ایسے ٹیچروں کی موجود ہوتی ہے جو اردو پڑھانے کے اہل ہیں مگر انسپکٹری حلقہ سے ان کو ایسی جگہ بدل دیا گیا ہے جہاں اردو نہیں ہو سکتی اور جہاں اردو چاہی جاتی ہے وہاں غیر اردو داں مامور کر دئے جاتے ہیں اس طرح طلبہ اردو چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنے قول کے ثبوت میں وفد نے ضلع جے پور، ناگور، سوجت ضلع پالی اور ضلع جھنجھنوں میں اردو کے کوالی فائڈ اساتذہ اردو کی ایک فہرست بطور نمونہ پیش کی یہ فہرست بطور نمونہ ہے اور بہت مختصر ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی سوال پیدا ہوا کہ جامعہ اردو کے امتحانات پاس شدہ اساتذہ کو گریڈ نہیں دئے جاتے اور باوجود راجستھان ایجوکیشن بورڈ اور راجستھان یونیورسٹی کے ان امتحانات کو تسلیم کر لینے کے ملازمت نہیں دی جاتی۔ بعد بحث و مباحثہ قرار پایا کہ اہلیت ملازمت کے لئے مثل ہندی وغیرہ کے امتحانات کے ان امتحانات کی بابت بھی حکومت راجستھان کا حکم ہونا ضروری ہے لہٰذا اس معاملہ کو انجمن راجستھان جداگانہ پیش کرے گی۔

وفد نے کہا کہ معائنہ کنندہ افسر اپنے معائنوں میں اردو کی تعلیم کی بابت باوجود اردو تعلیم جاری ہونے کے مطلق ذکر نہیں کرتے۔ اسی طرح پروگرام میں اردو کے اوقات تعلیم عام طور پر درج نہیں کئے جاتے اور باوجود شرائط مذکورہ پوری ہونے کے وہ حکم گورنمنٹ کے مطابق تعلیم اردو پر توجہ نہیں کرتے بلکہ ہندی پڑھنے کی ترغیب دینے اور اردو سے کنارہ کش ہو جانے کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔

وفد نے کہا کہ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ اردو میں مختلف مقررہ مضامین کی کتابیں نایاب ہیں۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں مختلف کلاسوں کے جملہ مضامین کی اردو کی نصابی کتب طبع کردہ "انوار بک ڈپو لکھنؤ" پیش کیں۔ قرار پایا کہ وہ ڈائرکٹر صاحب سے کتب نصاب نامزد کر کے سلیبس میں شامل کی جائیں۔ اسی طرح اسکولوں کی لائبریریوں میں جواب تک اردو کی مختلف قسم کی کتابیں اس لئے نہیں خریدی جاتی ہیں کہ وہ منجانب ڈائرکٹر صاحب منظور ہو کر "اپروڈ لسٹ" میں درج نہیں ہوتیں اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحبان نہایت آسانی سے عذر کرتے ہیں کہ "اپروڈ لسٹ" میں اردو کی کتاب نہیں ہے اس لئے نہیں خریدی جا سکتی، لہٰذا اب اردو کی قابل خرید کتابیں

لسٹ مذکور میں درج ہو کر اعلان کیا جائے۔

وفد نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ جہاں جہاں اُردو والوں کی معقول تعداد ہے وہاں توقع ہے۔ ان وارڈوں میں ایک یا زائد پرائمری اسکول ایسے نامزد کر دیے جائیں جو اُردو ذریعہ تعلیم کے ہوں۔ اسپیشل آفیسر صاحب اور ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب نے اس تجویز پر غور کرنے کا اقرار کیا۔

وفد نے یہ بھی یاد دلایا کہ جب سے پرائمری سکولوں کا تعلق پنچایتوں سے ہوا ہے، مزید دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں وفد نے یہ بھی ظاہر کیا کہ دسمبر ۱۹۶۰ کو راجستھان یونیورسٹی سے انجمن ہذا نے درخواست کی تھی کہ کم از کم صرف جے پور ہی میں اُردو کے ایم اے کے کلاس مہاراجہ کالج میں جاری کئے جائیں۔ یونیورسٹی نے یہ شرط عائد کی کہ ۲۰ طلبہ ہوں تو غور کیا جائے لہٰذا انجمن نے ایسے ۲۵ طلبہ کی درخواستیں پیش کیں۔ مگر آج ایک سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کی تعلیم سے اُردو والے محروم ہیں۔

اُردو کی درخواستیں نقل حکم اور دستاویزات

جیسا کہ گورنمنٹ راجستھان نے نومبر ۱۹۵۹ میں صاف حکم جاری کر دیا ہے کہ تمام دفاتر اور محکموں میں اُردو کی درخواست لینے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ وفد نے کہا کہ یہ آسانی عدالتوں کے لئے بھی ہونی چاہئے، اس پہلو پر کافی دیر تبادلۂ خیالات ہوا کیونکہ جو عدالتیں ہائی کورٹ کے ماتحت ہیں وہ ہائی کورٹ کے حکم ہی کی تعمیل کر سکتی ہیں۔ حکومت کے ایسے احکام ان کے لئے واجب التعمیل نہیں ہیں اور ہائیکورٹ اس وقت تک حکم نہیں دے سکتی جب تک کہ ایسا قانون نہ ہو جائے۔ وفد نے دستور ہند کی دفعہ ۳۵۰ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ تو ہر شخص کو حق ہے کہ خود کسی بھی زبان میں اپنی داد رسی کی درخواست پیش کرے اسی درمیان میں دیگر محکمات و دفاتر کے متعلق جائزے کا سوال ہوا کہ جو ہائی کورٹ کے ماتحت نہیں ہیں، تو اسپیشل آفیسر صاحب نے بتایا کہ گورنمنٹ نے ذریعہ سرکلر محکمات سے دریافت کیا ہے کہ اُردو کی کتنی درخواستیں پیش ہوئیں۔ تو وفد نے بتایا کہ ہمارے علم میں صرف ایک واقعہ تو کلکٹری جے پور کا ہے کہ ایک درخواست اُردو میں مردم شماری کے سلسلے میں متعلقہ ملازم نے لینے سے انکار کیا تھا جس کی وقت پر اطلاع دی گئی تھی اور اس پر کارروائی بھی ہوئی اور دوسرا سب انسپکٹر پولیس تھانہ رام گنج کا ہے کہ جس نے ایک چوری کی رپورٹ جو اُردو میں لکھی ہوئی تھی لینے سے انکار کیا تھا جس میں لطف کی بات یہ ہے کہ سب انسپکٹر نے جو تحریری جواب دیا ہے کہ ہندی میں رپورٹ کی جائے وہ اُردو میں لکھا ہے اور اُردو ہی میں اپنے دستخط کئے ہیں۔ یہاں اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے بتایا کہ ہم نے بڑے کی کارروائی حکومت کو شکایت بھیجی ہے کہ اسپیشل آفیسر صاحب نے وعدہ کیا کہ اس پر ضرور کارروائی ہوگی۔ وفد نے صاف طور پر اعتراف کیا کہ خود اہل معاملہ اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ہندی میں درخواست دیتے ہیں اور کوئی شکایت انجمن کو وصول نہیں ہوئی۔

نقل حکموں کی بابت یہ عمل ضرور ہے کہ اب اُردو کے کاغذات کی نقول اُردو ہی میں ملتی ہیں۔ مگر منشی داسو درلال ایڈوکیٹ رکن وفد نے بتایا کہ سب ڈسٹرکٹ میں جو اُردو کی نقلیں دی جاتی ہیں وہ کسی غیر ملازم اُردو داں سے کرا کر دی جاتی ہیں چونکہ سالہا سال ریاست جے پور، ٹونک اور دھول پور کی سرکاری زبان سنہ ۴۸ء کے بعد تک اُردو ہی ہے اس لئے بہت کچھ پچھلا ریکارڈ اُردو میں ہے۔ اس لئے جہاں جہاں یہ صورت ہے وہاں کم از کم ایک اُردو داں کلرک ضرور مامور ہونا چاہئے۔ وفد نے یہ بھی کہا کہ جو رجسٹرار اُردو داں ہیں ان کو تو اُردو کی دستاویزات کی نقل ہندی میں طلب نہ کرنی چاہئے۔ بہر حال یہ معاملہ خود اُردو والوں کے ذاتی مفاد یا تحفظ زبان پر منحصر ہے جیسا بھی وہ چاہیں۔ البتہ گورنمنٹ اپنے حکم کی تعمیل کرانے کو آمادہ ہے بشرطیکہ کوئی شکایت پیش آئے۔ اُردو کے ریکارڈ کی اُردو میں نقل دئے جانے کا حکم گورنمنٹ راجستھان نے ۲۶ جولائی ۶۰ کو جاری کیا ہے۔

وفد نے دعویٰ کیا کہ حکومت راجستھان کے پریس نوٹ شائع شدہ و حکم مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۵۹ء (نمبر F.10(15635)/59) جو راجستھان گزٹ مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی اب تک تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ کوئی قانون، ضابطہ، قواعد، اعلان یا اشتہار ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ جو اُردو میں شائع کیا گیا ہو۔ حتیٰ کہ کچھ کمیٹی کے قواعد و اعلانات تک کہ جو خود حکومت راجستھان کے جاری کردہ ہوتے ہیں، اُردو میں شائع نہیں ہوئے۔ یہی حال اعلانات متعلق اوقاف و کوآپریٹو سوسائٹی وغیرہ کا ہے۔ لہٰذا اسپیشل آفیسر صاحب نے یہ بات نوٹ کی اور اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے قواعد وغیرہ متعلق کچھ کی نقل طلب کی ہے جو ہندی میں ہو یا انگریزی میں۔

ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان

وفد نے احتجاج کیا کہ ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان جس کے دستور میں ہندی، اُردو، راجستھانی اور سنسکرت کے ادب کی ترقی موجود ہے اور اس کے لئے ۱/۲ لاکھ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے سے ملتا ہے اور اس روپے میں ان لوگوں کے ٹیکسوں سے وصول شدہ رقم بھی ہے، جن کی مادری زبان اُردو ہے اور اکیڈیمی کے دستور میں اُردو ادب کی ترقی بھی شامل ہے، مگر آج تک اُردو پر ایک پائی اس نے خرچ نہیں کی۔ حد تو یہ ہے کہ اُردو کی تحریر تک لینے سے تحریری طور پر انکاری ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے یہاں کوئی اُردو کا کلرک نہیں ہے۔ لہٰذا وفد نے پُرزور مطالبہ کیا کہ اکیڈیمی کا سلوک سب زبانوں کے ساتھ یکساں ہونا چاہئے۔

کلیم الدین عثمانی
اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان

[illegible]

بقیہ: پنڈت رام پرشاد بسمل

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہید ملک و ملت تیرے جذبوں پر نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

بسمل مرحوم کی چند غزلیں ملاحظہ فرمایئے :-

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد اُن کا پیام آیا تو کیا
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے
یوں سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا
مٹ گئیں ساری امیدیں مٹ گئے سارے خیال
اُس گھڑی گر نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا
اے دلِ ناکام مٹ جا کوچۂ دلدار میں
پھر مری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا
آخری شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

دیکھنا ہے کس قدر دم خنجرِ قاتل میں ہے
اب بھی یہ ارمان یہ حسرت دلِ بسمل میں ہے
غیر کے آگے نہ پوچھو اس میں ہے اک خاص راز
پھر بتا دیں گے تمہیں جو کچھ ہمارے دل میں ہے
کھینچ کر لائی ہے سب کو قتل ہونے کی امید
عاشقوں کا آج جمگھٹ کوچۂ قاتل میں ہے
پھرتے ہو کیوں ہاتھ میں چاروں طرف خنجر لئے
آج ہے یہ کیا ارادہ آج یہ کیا دل میں ہے
ایک سے کرتا نہیں کیوں دوسرا کچھ بات چیت
دیکھتا ہوں میں جسے وہ چپ تری محفل میں ہے
اُن پہ آفت آئے گی اک روز مر ہی جائیں گے
وہ تو دنیا میں نہیں جو کوچۂ قاتل میں ہے
ایک جانب ہے سپاہ اک جانب ہے قضا
کشمکش میں پڑ گیا ہوں جاں کس مشکل میں ہے
زخم کھا کر بھی اسے ہے زخم کھانے کی ہوس
حوصلہ کتنا تڑپنے کا ترے بسمل میں ہے

آؤ دو بھائیو! دل کھول کر ماتم کریں
ہم شہیدانِ وطن کی بے کسی کا غم کریں
ساتھ والوں نے خوشی سے جان دے دی ملک پر
رہ گئے اس فکر میں بیٹھے ہوئے کیا ہم کریں
راہِ حق میں مر مٹے غم زندگی کا ان کو کیا
جیتے جی ہم مر گئے جینے کا اپنے غم کریں
ماننے کی جو نہ ہو وہ بات کیوں کر مان لیں
غیر ممکن ہم عدو کے سامنے سر خم کریں
آپ ہی خلوت میں کاٹیں اپنے بھائی کا گلا
آپ ہی پھر بیٹھ کر احباب میں ماتم کریں
جب یہ حالت ہے ہمارے ملک کی اولاد کی
ظلم سے اغیار کے پھر شکوہ کیا ہم کریں
خوب روئے آپ تو حق رونے سے ہوتا ہے کیا
کام ان کا کیا کریں جو آہ و نالہ کم کریں

غیر حالت ہے مری دیکھنے آئے کوئی
کون ہے قصۂ غم جس کو سنائے کوئی
رو کے ہر یاس سے کہتا ہے یہ بھارت ماتا
مجھ کو کمزور سمجھ کر نہ ستائے کوئی
دودھ بچپن میں سپوتوں کو پلایا میں نے
اب ضعیفی میں ذرا آ کے بلائے کوئی
باپ کو بیٹے سے ہے بھائی کو بھائی سے دغا
رنج آپس کے جو ہیں اُن کو مٹائے کوئی
خوابِ غفلت میں پڑے سوتے ہیں جو اہلِ وطن
ہوش میں لائے کوئی ان کو جگائے کوئی
یہ زمانے کی ہے خوبی یہ مقدر کی ہے بات
چین سے سوئے کوئی چین نہ پائے کوئی
پھر نہ بسمل رہے دنیا میں کوئی اے بسمل
یعنی آزار زمانے کے اُٹھائے کوئی

رام پرشاد بسمل کے ایک مشہور فانی شعر پر منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی کی تضمین ملاحظہ فرمایئے :-

شہیدانِ وطن کی گور سے آواز آتی ہے
وہی ہم سے ملے آ کر جو اپنی جان پر کھیلے
اُدھر دنیا کی راحت ہے اِدھر لطفِ شہادت ہے
یہ سودا تیرے آگے ہے جو تو چاہے وہی لے لے
یہی جنس گراں قیمت بہ سہولت نہیں ملتی
جو آزادی کا خواہاں ہو وہ پہلے اپنا سر لے لے
ہزاروں ہی سلام ایسے فدائے ملک و ملت پر
فلاحِ قوم کی خاطر جو پیہم سختیاں جھیلے
کڑی جھیلیں جو قیدیں اور چڑھے پھانسی پہ ہنس ہنس کر
شہادت کا سبق لینا ہے جس جس کو وہ ان سے لے
مقولہ بسمل مرحوم کا یہ ہر زبان پر ہے
"شہیدوں کی چتاؤں پر جُڑیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا"

۱؎ رام پرشاد بسمل۔

ضروری اعلان

ازراہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

تالیف: پروفیسر خلیق احمد نظامی (شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی)
ناشر: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد۔ دہلی۔
حجم: ۴۰۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے۔

تاریخ کی کتابیں جو عموماً لکھی گئی ہیں وہ سلاطین کی معرکہ آرائیوں اور کشور کشائیوں کی داستانوں سے زیادہ نہیں۔ کسی عہد کی مذہبی، علمی، تبلیغی، سماجی سرگرمیوں کا اگر ذکر آ بھی گیا ہے تو محض ثانوی حیثیت سے اور ناکافی طور پر۔ ان حالات میں پروفیسر نظامی صاحب کی یہ گراں مایہ تالیف ہماری زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ موصوف کی وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر اور متانتِ اسلوب کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں، وہ جوان سال ہونے کے ساتھ عموماً پیرانہ اصابت رائے کے مالک ہیں۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات پر فیصلہ کن بحث کی خاطر انھوں نے تواریخ کے علاوہ علماء اور صلحاء کے تذکروں، ملفوظات، مکتوبات غرض ہر ممکن ماخذ سے کام لیا ہے۔ جس عہد پر وہ لکھ رہے ہیں اس میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور سلاطین کے مذہبی انداز فکر کا اثر ان کی سیاست پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لئے اس قسم کی تالیف کے بغیر عہد مذکور کی تاریخ کا مطالعہ ادھورا رہتا۔ کتاب کے شروع میں ایک فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جس کے ذیلی عنوانات کے تحت فاضل مؤلف نے بڑے مدلل انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد غلام، خلجی، تغلق اور لودی بادشاہوں کے مذہبی رجحانات دکھائے ہیں۔ کتاب کے آخر میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی ماخذ (جن سے مؤلف نے استشہاد کیا ہے) کی فہرست دے دی ہے۔

اتنی ضخیم کتاب میں کسی رائے سے اختلاف چنداں مستبعد نہیں۔ مثلاً علاء الدین خلجی کے "بہیمانہ" مظالم کے ہوتے ہوئے اس کی "دین داری" سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ (صفحہ ۲۰۵) اسی طرح محمد تغلق کے بزرگان چشت کے ساتھ تذلیل آمیز برتاؤ کے پیش نظر سلطان کی توجیہ محلِ نظر معلوم ہوتی ہے (صفحہ ۳۴۲) سلطان اپنے خیال میں خلفائے راشدین کے مبارک دور کی خصوصیات واپس لانا چاہتا تھا۔ لیکن خود اس کا طرز عمل عدلِ فاروقی اور حکمتِ مرتضوی سے کوسوں دور تھا۔ بہر حال یہ فاضلانہ تالیف نہایت بیش قیمت مواد اور مباحث پر مشتمل ہے جس پر ندوۃ المصنفین دہلی مبارکباد کا مستحق ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ تاریخی مسائل کے باوجود کتاب ادبی لطافت کی مایہ دار ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا۔

ہدایت الاسلام حصہ سوم

از مولانا نسیم بستوی صاحب۔
ناشر: مکتبہ لطیفیہ، براؤں شریف، پوسٹ سکھوئی (ضلع بستی)
قیمت۔ پچاس نئے پیسے۔

اس کتابچے میں سوال و جواب کی شکل میں نماز کے مسائل و احکام عام فہم اور آسان طریقے سے دئے گئے ہیں۔ یہ خدمت دین کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی خدمت ہے اور ہر طرح قابل قدر ہے۔ اس میں کہیں کہیں بعض مشکل اصطلاحات بھی آگئی ہیں۔ مثلاً خروج بصنعہ (جس سے مراد نمازی کا اپنے عمل یا ارادے سے نماز سے باہر آنا ہے)۔ تعدیل ارکان۔ قعدہ۔ تعوذ۔ تسمیہ۔ ثنا، دعائے ماثورہ۔ اگر وہیں یا فٹ نوٹ میں ان کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔

فاضل مصنف نے خطبۂ جمعہ اردو میں پڑھنے کو ناجائز کہا ہے۔ حالانکہ خطبے کا مقصد اگر عبادت کے ساتھ تذکیر (وعظ و پند) بھی ہے تو مادری زبان میں ہدایات کا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے سلسلے میں ہے وہ قرآن سے یعنی آپ لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ مادری زبان کے بغیر نصیحت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہو کہ اردو کے ساتھ خطبۂ ماثورہ کی عبارت بھی خطیب ادا کرے تاکہ دونوں کی رعایت رہے۔

تصویر کائنات

مرتبہ خضر برنی۔
ملنے کا پتا۔ خضر بک ڈپو۔ بلند شہر۔
قیمت۔ ایک روپیہ۔

اس میں مسلمان اور ہندو درویشوں مثلاً بابا فرید، امیر خسرو، گرو نانک، سورداس، تلسی داس وغیرہ کے حکیمانہ دوہے، منظوم ترجمے کے ساتھ جمع کر دئے گئے ہیں۔ شروع میں ان کے مصنفین کا مختصر تعارف ہے۔ ترجمے میں فنی اغلاط زیادہ ہیں۔ بعض مصرعے بھی وزن سے خارج ہیں۔ کاغذ و کتابت خراب ہے۔

اورینٹل کالج کے سپلیمنٹری امتحانات

اورینٹل کالج بمبئی کے سپلیمنٹری امتحانات شعبۂ اردو (ادیب، منشی، منشی عالم) ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء اور شعبۂ اسلامیات (ابتدائی، معلم اسلامیات، ماہر اسلامیات) ۴ فروری ۱۹۶۳ء سے شروع ہوں گے
دستور و نصاب منگوانے کا پتہ
پرنسپل اورینٹل کالج۔ بھنڈی بازار۔ بمبئی ۳

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ [illegible] نسیم الدین فریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا